ہرمینیات: تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ کا خلاصہ

تصنیف و تنقید: ڈاکٹر مصطفی عزیزی

خلاصہ و ترجمہ: عبدالباسط پتافی

تلخیص کے بارے

ڈاکٹر مصطفی عزیزی کی کتاب عربی زبان میں ہے جو کم و بیش 180 صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت سادہ، واضح اور آسان انداز میں مختلف نظریات کو سمجھایا گیا ہے لہذا ہمیں محسوس ہوا کہ اس کا ایک خلاصہ اردو زبان میں بھی مہیا کیا جائے۔

ڈاکٹر کی کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے کئی ایک ماخذ و مصادر سے استفادہ کیا ہے اور کئی مفکرین کے نظریات کو ان کے اصل ماخذ ہی سے سمجھا ہے۔

ان کی کتاب کا عربی میں یہ نام تھا: الهرمينوطيقا و اشكالية التاويل و الفهم: عرض و نقد

ہم اس تلخیص میں یہ دیکھیں گے کہ انہوں نے دیگر نظریات کو کیسے بیان کیا ہے، ان پر ان کی تنقید کیا ہے اور پھر آخر میں یہ کہ انہوں نے اپنا کیا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

لہذا ہم نے کہیں بھی نہ اتفاق کیا ہے اور نہ اختلاف کا اظہار کیا ہے تا کہ دیانتداری اور معروضی خلاصہ پیش کیا جا سکے۔

ڈاکٹر مصطفی عزیزی

آپ ایک ایرانی مفکر ہیں اور مختلف اداروں سے علمی کاموں کے لیے وابستہ ہیں۔ آپ نے قرآن و حدیث کے علوم میں بیچلر کی ڈگری، فلسفہ و کلام میں ماسٹرز اور تقابلی فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کرر کھا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی ایک کتب لکھی ہیں جن کا تعلق فلسفہ اسلامی اور جدید افکار و نظریات کے جائزہ و تنقید پر مبنی ہے۔

ہرمینیات (Hermeneutics) کیا ہے؟

لغوی طور پر یہ لفظ یونانی زبان (ἑρμηνεύω) سے نکلا ہے جس کے معنی تفسیر کے ہیں۔

اور ہم اس علم کو علم تاویل یا فنِ تفسیر کہہ سکتے ہیں۔

اصطلاحی معنی

اس کی کوئی ایک اصطلاحی تعریف کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ مختلف مکاتبِ فکر اور مفکرین نے اپنے اپنے زاویہ سے ہرمینیات کو سمجھا اور اس کی تعریف کی ہے۔

ہرمینیات کے ادوار

یہاں مختصر طور پر یہ دیکھیں گے کہ کس کس طرح ہرمینیات کا زمانہ گزرا اور نظریات سامنے آئے ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ کیوں اس کی کوئی ایک اصطلاحی تعریف ممکن نہیں۔

پہلا مرحلہ: عہدِ تنویر (Enlightenment) سے پہلے کتاب مقدس کی تشریح و توضیح کا حق صرف ارباب کلیسا کو تھا اور ان کی توضیح حکم خدا کا درجہ رکھتی تھی جیسے کتاب مقدس کا متن اس حیثیت کا حامل تھا مگر مارٹن لوتھر کی تحریک نے کتاب مقدس کو سب سے جوڑا کہ بائبل کو ہر کوئی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔

پس اس نتیجہ میں متن میں موجود ابہام، تعقید اور غموض کو ختم کرنے اور اس کے قواعد مرتب کرنے کا نام ہرمینیات ہوا۔

دوسرا مرحلہ: ابھی ہم جان آئے کہ کبھی متن میں ابہام و غموض ہونے کی وجہ سے اس کی تفسیر کرنا پڑتی ہے جو ہرمینیات کہلایا ہے مگر یوہان مارٹن کلادی نیئس (Johann Martin Chladenius) (وفات: 1759 عیسوی) نے کہا فہم اور سمجھنے میں جو ابہام پیدا ہوتا ہے اس کی تفسیر کا نام ہرمینیات ہے۔

تیسرا مرحلہ: ہم کسی بھی متن کو سمجھنے میں سوئے فہم اور غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں لہذا اصل غلط فہمی ہیں پس ہم اس غلط فہمی کو دور کرنے کے قواعد مرتب کریں گے تاکہ مصنف کی نیت و مراد تک پہنچا جا سکے اور ہرمینیات اسی کا نام ہے۔(شلائرماخر وفات: 1834 عیسوی)

چوتھا مرحلہ: ہرمینیات کا کام محض نصوص تک محدود نہیں بلکہ تمام انسانی علوم میں غلط فہمی سے بچنے اور اصل مراد تک پہنچنے کے قواعد مرتب کرنے کا نام ہرمینیات ہے۔(دلتائے وفات 1911 عیسوی)

پانچواں مرحلہ: ہرمینیات دراصل نام ہے وجود کو سمجھنے کا کیونکہ ہمارا فہم ہمارے وجود سے الگ نہیں بلکہ ہمارا فہم خود وجود کا حصہ ہے لہذا وجود انسانی کو سمجھنا ہی ہرمینیات کا کام ہے۔(مارٹن ہائڈیگر 1976 عیسوی)

چھٹا مرحلہ: فہم کیا ہے؟ فہم کام کیسے کرتا ہے؟ ہم کسی چیز کو سمجھتے کیسے ہیں؟ اور وہ کیا شرائط ہیں جن سے فہم متحقق ہوتا ہے؟ ایسے سوالوں سے بحث کرنے والا علم "ہرمینیات" ہے۔ (گادامر وفات 2002)

ساتواں مرحلہ: ہم محض مظہریات (phenomenology) تک نہیں رک سکتے بلکہ ان کے پیچھے کارفرما معنیات کا سلسلہ سمجھنے کا کام "ہرمینیات" ہے۔ (پال ریکور 2005 عیسوی)

آٹھواں مرحلہ: مدلول (معنی) کو دال (لفظ وعلامت) سے جدا کرنا اور تشریح کی صورت میں نئی تحریر سے پرانی تحریر پر حکم و تعلیقہ لگانا ہرمینیات ہے۔

ژاک دریدا (2004ع) یہ کہنا چاہتا ہے کہ لفظ و معنی میں فاصلہ ہوتا ہے لہذا لفظ مستقل طور پر معنی تک نہیں پہنچاتے اور ہم اپنی تشریح سے مزید فاصلہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہرمینیات کی یہ بھی تعریف کرتا ہے کہ ہرمینیات نصوص و متون کی تشریح و تاویل کا فن ہے جس میں جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی مسائل قاری کو متن سے دور کر دیتے ہیں لہذا اس دوری کو مختلف زاویوں کی قرائت اور متعدد تشریحات ہی سے دور کیا جا سکتا ہے۔

نواں مرحلہ: ہرمینیات میں ہم یہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ متن سے کس طرح مصنف کی مراد کو سمجھا جاسکتا ہے اور کون سے قواعد مرتب کر کے ہم سوئے فہم سے احتراز کر کے درست فہم حاصل کر سکتے ہیں۔(ڈولنڈ ہرش: حیات)

ہرمینیات کی انواع

1۔ہرمینیاتِ خاصہ:

ہرمینیات کا ایسا نظریہ جو ہر ہر علم میں الگ الگ اصول و قواعد کو مد نظر رکھنے کا قائل ہو۔اگر قانون کا متن ہے تو الگ ہرمینیات ہو گی اسی طرح تاریخ، کتاب مقدس یا ادبی متون ہیں تو الگ قواعد مرتب ہوں گے۔

پس ہر علم و فن کے لیے ایک خاص ہرمینیات کے نظریہ کا قائل ہونا اس نوع میں شامل ہے۔

2۔ہرمینیاتِ عامہ اس نوع میں ان کا نظریہ شامل ہے جو کہتے ہیں کہ ہر طرح کے علم و فن کے لیے ایک جیسے قواعد واصول جن کی مدد سے درست فہم تک پہنچا جاسکے۔

3۔فلسفیانہ ہرمینیات (PhilosophicalHermeneutics)

خود فہم پر بحث کرنا کہ فہم (Understanding) کیا ہے؟کام کیسے کرتا ہے؟اور کس طرح متحقق ہوتا ہے؟جیسا کہ ہائڈیگر اور گادامر نے کیا۔

اہم نظریات کا جائزہ اور تنقید

ہرمینیات کے لغوی معنی، اس کے مختلف تاریخی مراحل اور انواع جاننے کے بعد اب اہم اور نمایاں نظریات کا جائزہ لینا مناسب ہو گا۔

نظریہ شلائرماخر (1768تا1834)

فریڈرک شلائرماخر (Friedrich Schleiermacher) جدید ہرمینیات کے بانی شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا ماننا تھا کہ ہرمینیات ایسا فن ہے جو تمام نصوص و متون کو شامل ہے چاہے وہ ادبی، دینی یا قانونی متون وغیرہ ہوں۔

دوم یہ کہ قاری متن سے مصنف کی نیت و ارادہ کو جان سکتا ہے اور یہ مطلوب بھی ہوتا ہے۔

سوم یہ کہ اصل سوئے فہم اور غلط فہمی ہے یعنی ہم اصلا متن کو پڑھتے ہوئے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں لہذا ایسے قواعد مرتب کرنا ہوں گے جس سے درست فہم تک پہنچا جا سکے۔

چہارم یہ کہ لفظی و نحوی اور ادبی قوانین کی رعایت سے معنی تک رسائی حاصل کرنا

پنجم یہ کہ قاری کو وہ تمام حالات سامنے رکھنا ہوں گے جن سے مصنف نے گزر کر متن تخلیق کیا تاکہ غلط فہمی رفع ہو جائے۔ پس مصنف کی نفسیاتی، شخصی، ثقافتی اور ذہنی کیفیات کو سمجھنا تاکہ متن سے اس کی نیت تک پہنچا جا سکے۔

ششم یہ کہ کسی بھی متن کے کسی جزء یا حصے کو سمجھنے کے لیے پورا متن سامنے ہونا چاہیے اور مصنف و مولف کی دیگر تصنیفات یا آثار بھی دیکھنے ہوں گے تاکہ کلام کا مطلوبہ جزء بھی سمجھا جاسکے اور پورا کلام بھی۔

ہرمینیاتی دائرہ (Hermeneutic Circle)

شلائرماخر کی فکر میں ہمیں ایک **دَور** نظر آتا ہے وہ یوں کہ کلام اور جملوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں مفردات اور کلمات کو سمجھنا ہوگا اور مفردات و کلمات تب سمجھ آئیں گے جب کلام اور جملے سمجھ آئیں گویا جملوں اور کلام کا سمجھنا مفردات پر متوقف ہے اور مفردات کا سمجھنا جملوں پر منحصر ہے۔

پس شلائرماخر کے یہاں کل و جزء کا یہ جدلیاتی رُخ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

سوال: دائرہ (یا دور) تو محال ہوتا ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ایک چیز خود پر ہی مقدم ہے۔؟

حل: شلائرماخر نے اس کا حل یوں پیش کیا ہے کہ جب قاری کلام کا کوئی جزء یا حصہ پڑھتا ہے تو اسے ایک **"وجدانی ادراک (حسد)"** حاصل ہوتا ہے جس کا سمجھنا کلام کے دوسرے جزء پر متوقف نہیں ہوتا مگر یہ وجدانی ادراک درست بھی ہو سکتا اور غلط بھی لہذا جب پورا کلام پڑھ لیا جاتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وجدانی ادراک درست تھا کہ نہیں۔

تنقید

اول: اگر ہم دوسرے زاویہ سے دیکھیں تو شلائرماخر پر ایک اور نقد ہو سکتا ہے کہ ان کا ہرمینیاتی دائرہ اب بھی باقی ہے وہ یوں کہ مصنف کے ذہنی، نفسیاتی، ثقافتی اور دیگر اہم پہلوؤں کو سمجھنا جن میں مصنف

رہتا ہے، ہمارے ممکن اس صورت ممکن ہے جب ہم اس کی دیگر تصنیفات اور آثار کا مطالعہ کریں جبکہ آثار و تصنیفات کا سمجھنا مصنف کے ان حالات (ذہنی، ثقافتی، نفسیاتی، اجتماعی وغیرھا) پر متوقف ہے۔ پس مصنف کے ان حالات کا سمجھنا اس کے آثار پر موقوف ہے اور ان کے آثار کا سمجھنا ان حالات کے سمجھنے پر موقوف ہے اور یہ دَور ہے اور دور محال ہوتا ہے۔

دوم: اگر ہم مان لیں کہ کسی متن سے مصنف کی نیت وارادہ کو تبھی سمجھا جا سکتا جب ہم خود بھی ان تمام حالات کو دہرائیں جن سے مصنف گزرا ہے تو ایسا عسر وحرج لازم آئے گا جس کی تلافی ممکن نہیں۔ کیا ہم شلائرماخر کے حالات کو دہرا سکتے ہیں کہ اس کا متن سمجھ سکیں؟ ہر گز نہیں۔ اور یہ شرط سیرت عقلاء کے بھی خلاف ہے اور اہم بول چال، گفتگو اور بات چیت کی روش سے بھی ہم آہنگ نہیں۔

سوم: شلائرماخر کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اصل غلط فہمی ہے بلکہ معاملہ اس کے الٹ ہے کیونکہ اصل درست سمجھنا ہے تاہم کبھی کبھی غلط فہمی ہو جاتی ہے اور عرف ومعاشرہ اسی بنیاد پر چل رہا ہے۔

چہارم: شلائرماخر نے ہرمینیاتی دائرہ سے بچنے کے لیے "وجدانی ادراک" کو پیش کیا۔ کیا وجدانی ادراک کو علمی طور پر ثابت بھی کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے لیے علمی ضابطہ مقرر کرنا بھی ممکن ہے؟

نظریہ دلتائے (1833تا1911)

جرمن فلسفی دلتائے (Wilhelm Dilthey) شلائرماخر سے کافی متاثر تھا مگر اس نے شلائرماخر کی فکر سے آگے بڑھ کر ہرمینیات میں ایک نیا باب کھولا۔

وہ شلائرماخر کی طرح قائل تھا کہ ہمیں مصنف کے ان حالات کو دہرانا ہوگا جن میں اس نے متن کو تخلیق کیا ہے تاکہ ہم درست بات تک پہنچ سکیں لیکن دلتائے محض نصوص تک نہیں رکا بلکہ اس کا ماننا تھا کہ ہرمینیات کا محور و مرکز "**حیات**" کو سمجھنا ہے نہ کہ محض متن کو۔ جس طرح عمانوئیل کانٹ نے تجربی و طبیعیاتی علوم (Natural Sciences) کا دفاع کیا بلکل اسی طرح دلتائے نے انسانی علوم (Human Sciences) کا دفاع کیا۔

دلتائے کا ماننا تھا کہ تمام انسانی علوم (ثقافت، تاریخ، فلسفہ، مذہب اور ادب وغیرہ) طبیعیاتی علوم سے جدا ہیں اور ان کا فہم الگ طرح سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم ضوابط و قواعد کی مدد سے درست فہم حاصل کر سکتے ہیں اور انسانی علوم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکتے ہیں جیسا کہ فی الواقع وہ ہیں لہذا ہمیں اضافیت (Relativism) اور تشکیک کی جانب بڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

پس دلتائے نے "مقولاتِ حیات" تشکیل دیے جن کی مدد سے انسانی علوم کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جا سکتا ہے۔

بعض مقولاتِ حیات ذیل میں دلتائے کے چند اہم مقولات حیات پیش کیے جا رہے ہیں:

1۔ ظاہر و باطن کا تعلق خارج میں جو کچھ ظاہر ہو رہا ہوتا ہے محض ان کی تشریح کرنا اور سمجھنا کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں ان کی تہہ میں جا کر وہ معانی تلاش کرنے ہوں گے جن کی وجہ سے یہ چیزیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ پس خارج میں ظاہر ہونے والی چیزوں کا ہمارے باطن سے گہرا تعلق ہے۔ جیسے؛ چیخنا۔ اس میں غضب کا مفہوم پوشیدہ ہے۔

2۔ مقولہِ طاقت (Power) کے ذریعہ سے ہم چیزوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

3۔ مقولہِ قدر (Value) ایسا مقولہ ہے جس سے ہم زمانہِ حال (موجودہ زمانہ) کا تجربہ کرتے ہیں۔

4۔ مقولہِ غرض (Purpose) سے ہم مستقبل میں حصہ لے پاتے ہیں۔

5۔ مقولہِ معنی (Meaning) سے ہم ماضی اور تاریخ کو سمجھتے ہیں۔

تنقید

دلتائے کا نظریہ کچھ پہلوؤں سے اچھا ہے مگر اس میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ مفسر کو اس کی اپنی تاریخ اور سماجی حالات سے بالکل آزاد تصور نہیں کرتا؛ کیونکہ ہر مفسر اپنی تاریخ اور معاشرہ کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے، اس لیے یہ نظریہ عملاً مکمل طور پر نافذ نہیں ہو پاتا۔

دوم: دلتائے نے "حیات" کو مبہم اور غیر واضح چھوڑا ہے۔

سوم: دلتائے کی ہر مینیاتی فکر میں ایک اہم کمی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو اتنی وضاحت اور ترتیب سے نہیں بتا پایا کہ قاری آسانی سے سمجھ سکے کہ زندگی کے تجربات کو سمجھ کر انسانی علوم کے پیچیدہ مسائل کیسے حل ہوتے ہیں۔

چہارم: تمام انسانی علوم کے لیے ایک ہی منہج اور قواعد مرتب کرنا محال ہے کیونکہ علوم کے موضوع و مسائل بدلنے سے منہج بدل جاتا ہے۔

نظریہ مارٹن ہائڈیگر(1889تا1976)

بیسوی صدی عیسوی میں فلسفیانہ ہرمینیات کے بنیاد گزاروں میں مارٹن ہائڈیگر (Martin Heidegger) کا نام نمایاں ہے۔ہائڈیگر نے ہرمینیات کو اپنے نظریہ فلسفہ ہی کے تحت دیکھا اور بتایا کہ ہر وہ چیز جو انسانی وجود کی تفسیر کرے وہ ہرمینیات ہے۔

ہائڈیگر کا نظریہ درج ذیل امور سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے:

1۔ انسانی فہم اور انسان کا وجود دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ہمارا فہم بھی وجود ہی کا حصہ ہے اور ایک تاریخی تسلسل میں جس طرح انسان کا وجود بنا ہے اسی طرح فہم بھی وجود پذیر ہوا ہے۔

پس ہرمینیات مظہریات (phenomenology) کو مد نظر رکھ کر دازائن (Dasein) کو سمجھنا ہے۔

2۔ ہمارے فہم میں پہلے سے معلومات ہوتی ہیں اور ذہن ایک خاص بناوٹ اختیار کر چکا ہوتا ہے لہذا کسی بھی چیز کو خالی الذہن ہو کر نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ہم پہلے سے موجود معلومات، تصورات اور مفروضات کی عینک سے چیزوں کو سمجھتے ہیں۔

وہ معلومات تین طرح کی ہوتی ہیں:

الف)پیش یافت (Fore having)

طولِ تاریخ میں مفسر کے پاس پہلے سے معلومات، مفروضے اور تجربات ہوتے ہیں۔

ب)پیش تناظر (Fore Sight)

کسی بھی چیز کو سمجھنے سے پہلے مفسر کا ایک خاص طرح کا ذہن بن چکا ہوتا ہے اور وہ اسی زاویے اور تناظر سے ہی چیزوں کا فہم حاصل کرتا ہے۔

ج)پیش تصورات (For Conception)

فہم میں پہلے سے کسی چیز یا متن کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں اور انہیں سے وہ دیکھنے لگ جاتا ہے۔

ان تینوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے پہلے سے قائم شدہ تصورات و مفروضات میں کسی چیز کو سمجھتا ہے لہذا وہ کبھی بھی حقیقت کو ویسا نہیں سمجھ سکتا جیسا کہ وہ ہے کیونکہ ہر مفسر کا فہم الگ الگ تصورات و مفروضات پر مبنی ہوتا ہے لہذا ہر کسی کی نسبت وہ متن یا چیز الگ الگ معنیٰ رکھتی ہے۔

3- مفسر کا فہم متن سے معانی تخلیق کرتا ہے نہ کہ متن مفسر کو معانی تک پہنچاتا ہے۔

4- انسانی فہم وجود ہی کا حصہ ہے جو ان تاریخی و ثقافتی زمانوں میں بنتا ہے جس میں مفسر جی رہا ہوتا ہے لہذا شلائر ماخر کی طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر مفسر ان حالات کو دہرائے اور سامنے رکھے جن میں مصنف نے تصنیف کو تخلیق کیا ہے تا انسان مصنف کی مراد کو سمجھ سکتا ہے بلکہ ہائڈیگر کے نزدیک ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اس کو دہرائے کیونکہ مفسر کا اپنا ایک الگ فہم بن چکا ہوتا ہے۔

ہرمینیاتی دائرہ

ہائڈیگر کی فکر میں بھی ایک دَور (دائرہ) پایا جاتا ہے وہ یوں کہ ہمارے پاس دو فہم ہیں:

ایک "فہمِ سابق" جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تاریخ و ثقافت کے تحت پروان چڑھا ہے۔

دوسرا "فہمِ لاحق" ہے۔

"فہم سابق" کی مدد سے ہم "فہم لاحق" کو کشف کرتے ہیں جبکہ "فہم لاحق" حاصل ہو جائے تو اس کی مدد سے ہم "فہم سابق" کو کشف کرتے ہیں لہذا دونوں ایک دوسرے پر متوقف ہیں اور یہ دائرہ ہے۔ اور دائرہ محال ہوتا ہے۔

فہم کیا ہے؟

ہائڈیگر کے نزدیک "فہم" کوئی تحفہ یا شعور میں موجود ایسا ملکہ نہیں کہ وہ دیگر چیزوں کی تعبیر کرے اور "حیات" کے معنی سمجھائے اور نہ فہم کے ہم مالک ہیں بلکہ "فہم" کو ہم خود بنایا ہوتا ہے اور اس میں موجود پہلے سے مفروضات کی مدد سے ہم "وجود" کے ممکنات کا ادراک کرتے ہیں۔

تنقید

ان پر اور گادامر پر ایک ساتھ تنقید کریں گے لہذا پہلے گادامر کی رائے کو پیش کرتے ہیں۔

نظریہ گادامر (1900تا2002)

جرمن مفکر ہانس جورج گادامر (Hans Georg Gadamer) نے فلسفیانہ ہرمینیات کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اسے مکمل واضح کیا۔ آپ نے ہرمینیات کا موضوع "فہم" کو قرار دیا کہ آخر "فہم" ہے کیا؟ اس کی ماہیت و حقیقت کیا ہے؟ اور کس طرح فہم متحقق ہوتا ہے؟

گادامر کی فکر میں "فہم"، "تبیین" اور "تطبیق" کلیدی مفاہیم ہیں۔

آیئے ہم ان کی فکر کو درج ذیل نکات میں سمجھتے ہیں:

1- کلاسیکی اور رومانوی ہرمینیات میں مفسر لغوی و ادبی اور قرائنِ حالیہ و مقامیہ سے مصنف کی مراد و نیت تک رسائی حاصل کر سکتا تھا جبکہ گادامر کے نزدیک فہم کی زمام مفسر کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ مفسر خود فہم کا ایک کھلونا ہوتا ہے یعنی متن سے معنی کا حصول متعدد عوامل رکھتا ہے جن میں سے ایک مصنف بھی ہے۔

2۔ کسی بھی متن کا فہم حاصل تب ہو سکتا ہے جب مکالمہ قائم ہو، یعنی مفسر متن سے سوال کرے اور متن بھی مفسر کو مخاطب کرے۔ اور جب یہ مکالمہ ہو گا تو امتزاجِ افقین (Fusion of Horizon) پیدا ہو گا۔

"امتزاجِ افقین" سے مراد یہ ہے کہ مفسر کا افق اور متن کا افق آپس میں مل جائے تا کہ نیا فہم وجود میں آ سکے۔

3۔ انسانی فہم تاریخ سے گزرتا ہے لہذا کسی بھی متن کا فہم حتمی نہیں ہوا کرتا اور نہ کسی طرح ان معنی کو حاصل کیا جا سکتا ہے جو مصنف کی مراد کہے جا سکیں بلکہ ہر وہ فہم جو متن سے حاصل ہوتا ہے وہ درست و صائب ہے۔

4۔ ہر فہم پہلے سے موجود مفروضات و تصورات کے تحت ہی متن کو سمجھتا ہے اور اسی طرح مفسر کی توقعات، اغراض اور حاجتیں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

5- زبان، معانی و مفاہیم کو منتقل کرنے کی علامت نہیں ہے اور نہ ہی یہ افکار کو منتقل کرنے کا وسیلہ ہے بلکہ زبان اور تفکر کا آپس میں گہرا ربط ہے، پس یہ زبان ہی ہے جو انسان کو "فہم" تک لے جاتی ہے۔

گادامر کی فکر کے نتائج

گادامر کی فکر سے چند ایک نتائج نکلتے ہیں:

الف) فلسفیانہ ہرمینیات میں ہم واقع اور حقیقت تک نہیں پہنچتے بلکہ یہ سب نسبتی (Relative) بن جاتا ہے۔

ب) فہم تاریخ میں بنتا ہے یعنی تہذیب و تمدن، ثقافت و تاریخ اس کو بناتے ہیں لہذا ہر مفسر کا فہم الگ ہوگا اور متن سے الگ نتائج برآمد ہوتے رہیں گے۔ پس کوئی بھی فہم آخری و حتمی نہیں ہو سکتا۔

ج) ہمارے پاس کوئی معیار نہیں کہ ہم کسی ایک فہم کو صحیح اور دوسرے کو غلط قرار دیں۔

د)ایسا نہیں ہے کہ ایک مفسر نے ذہن میں مفروضات و تصورات بٹھا لیے ہیں اور وہ متن کو پڑھنے لگا ہے بلکہ گادامر کی فکر میں یوں ہے کہ فہم انہی مفروضات و تصورات کے تحت پروان چڑھتا ہے گویا ان کے بغیر فہم ہوتا ہی نہیں سو چار و ناچار مفسر کا فہم ان پیش تصورات و مفروضات سے کسی طور آزاد نہیں ہو سکتا۔

ھ)مفسر متن سے سوال کرتا ہے اور پھر متن بھی مفسر سے سوال کرتا ہے اور یوں امتزاجِ افقین پیدا ہوتا ہے۔

کلاسیکی و فلسفیانہ ہرمینیات

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں کہ ہائڈیگر اور گادامر نے فلسفیانہ ہرمینیات کو وجود بخشا لہذا ان دونوں کے افکار جاننے کے بعد پہلے ہم فرق بیان کرتے ہیں اور پھر وہ اعتراضات رقم کریں گے جو فلسفیانہ ہرمینیات پر وارد ہوتے ہیں۔

1۔کلاسیکی (ورومانوی)ہرمینیات میں قاری متن سے مصنف کی مراد تک پہنچ سکتا تھا جبکہ فلسفیانہ ہرمینیات میں ایسا ممکن نہیں

2۔کلاسیکی ہرمینیات میں انسان قواعد کو مرتب کر کے غلط فہمی سے اجتناب برت سکتا ہے جبکہ فلسفیانہ ہرمینیات میں انسانی فہم پیش مفروضات و تصورات سے جدا ہو ہی نہیں سکتا۔

3۔ فلسفیانہ ہرمینیات انسانی فہم کو "تاریخیت (Historisim)" کی رو سے دیکھتی ہے کہ انسانی فہم تاریخ و ثقافت میں بنتا ہے جبکہ کلاسیکی ہرمینیات میں انسان ادبی و دیگر قواعد کی روشنی میں مصنف کی نیت تک پہنچا جاتا ہے۔

4۔ فلسفیانہ ہرمینیات میں متن کے معانی لامحدود و لامتناہی ہوتے ہیں جبکہ کلاسیکی ہرمینیات میں متن کے اصل معنی محدود ہوتے ہیں جو مصنف کی مراد ہوتے ہیں۔

5۔ کلاسیکی ہرمینیات میں غلط اور درست فہم میں تمیز کی جاسکتی ہے جبکہ فلسفیانہ ہرمینیات میں ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔

6۔ کلاسیکی ہرمینیات میں زبان معانی و تصورات کی منتقلی کا ایک وسیلہ ہے اور مفسر ابہام و غموض کو دور کرنے کے لیے قواعد مرتب کرتا ہے جبکہ فلسفیانہ ہرمینیات میں زبان معانی و مفاہیم کی منتقلی کا وسیلہ ہی نہیں۔

فلسفیانہ ہرمینیات پر تنقید

1۔ فلسفیانہ ہرمینیات میں کئی ایک ایسا دعوے ہیں جو خود کو خود ہی باطل کرتے ہیں۔

مثلاان کا یہ کہنا کہ "ہر فہم پہلے سے موجود مفروضات و تصورات کے تحت چیزوں کو سمجھتا ہے" تو اب سوال یہ ہے کہ خود یہ بات بھی تو کسی نہ کسی پیش مفروضہ و تصور پر مبنی ہو گی تو اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ کوئی اٹل قانون نہ ہوا کیونکہ مختلف مفروضات و تصورات کا حامل فہم ممکن ہے کہ یہ کہے کہ انسانی فہم

پہلے سے موجود مفروضات و تصورات سے جدا ہو کر بھی چیزوں کو سمجھتا ہے۔ یوں یہ تناقض ہوا کیونکہ ایک بار کہا گیا کہ فہم پیش تصورات و مفرعضات کے بغیر ہوتا نہیں اور پھر خود یہ فہم بھی اضافی و نسبتی ہے تو اسے اٹل قانون نہیں بنایا جا سکتا اور اگر یہ اٹل نہیں تو اس کی وقعت نہیں اور اگر اس کو اٹل مانا جائے تو پھر یہ مان لیا گیا کہ ایک فہم ایسا ہے جو پیش تصورات و مفروضات کے بغیر ہے۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ "ہر فہم تاریخ میں ایک خاص ثقافتی فضا میں پروان چڑھا اور بنا ہے" تو خود یہ بات بھی تو تاریخی ہوئی؟

2۔ فلسفیانہ ہرمینیات میں فہم نسبتی (Relative) ہوتا ہے اور ہر مفسر اپنے پاس پہلے سے موجود تصورات و مفروضات کے تئیں سمجھتا ہے تو پھر خود فلسفیانہ ہرمینیات کا مدعا بھی کوئی ایک نہیں رہے گا؛ کیونکہ ہر مفسر اپنے تئیں اس کو سمجھے گا اور ہم کسی بھی فہم کو غلط صحیح نہیں کہہ سکتے بلکہ ہر فہم صحیح ہوتا ہے تو پھر فلسفیانہ ہرمینیات کا مدعا بھی کوئی ایک نہیں رہے گا اور جو بھی جیسے اس کو سمجھے گا وہ درست قرار پائے گا۔ اگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خود ہی اپنے مدعا کا انکار کر رہے ہیں۔

3۔ گادامر نے کہا کہ مفسر متن سے اور متن مفسر سے سوال پوچھتا ہے اور مکالمہ کی صورت ایک نیا فہم وجود میں آتا ہے۔ یہاں یہ سوال حل طلب ہے کہ آخر متن کس طرح سوال پوچھتا ہے؟ پس مفسر و متن میں سوالات کا یہ دعوی محض ادعاء ہی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ یہاں ایک اور اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ اگر متن میں کوئی معنی ہی نہیں ہوتے بلکہ مفسر اس میں معنی پیدا کرتا ہے تو پھر متن سوال کیسے پوچھ سکتا ہے؟ سوال تو تبھی ممکن ہے جب متن کے اپنے کوئی معنی فرض کیے جائیں۔

4۔ گادامر کا یہ کہنا بھی بغیر دلیل کے ہے کہ اگر مفسر متن سے سوال پوچھے گا تو ہی کچھ حاصل کر سکے گا؛ کیونکہ متن سے سوال پوچھے بغیر بھی معانی حاصل ہوتے ہیں۔

5۔ فلسفیانہ ہرمینیات میں مصنف کو پس پشت ڈال کر یہ کہنا کہ متن سے مصنف کی نیت و مراد نہیں سمجھی جاسکتی سراسر عرف و سیرتِ عقلاء کے خلاف ہے کیونکہ تمام انسان عام بول چال میں ظاہر پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنا مدعا پیش کرتے ہیں۔

6۔ گادامر کی بات میں بھی تضاد و تناقض ہے کیونکہ ایک بار وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی فہم پیش تصورات و مفروضات کے بغیر نہیں ہوتا اور پھر خود یہ بھی کہتا ہے کہ مفسر کو چاہیے کہ ان پیش مفروضات و تصورات کو نہ اپنائے جس کا تعلق متن سے نہیں بنتا !

7۔ گادامر نے کہا کہ انسانی فہم پہلے سے موجود تصورات و مفروضات سے جدا نہیں ہو سکتا لہذا ہر مفسر ان کے آگے مجبور ہے کیونکہ اس کا فہم تاریخ کے اس تسلسل میں بنا ہے۔ جبکہ یہ بات بھی علی الاطلاق درست نہیں کیونکہ نہ جانے کتنے ہی پیش تصورات و مفروضات سے مفسر خود کو دور کر سکتا ہے تاہم کچھ تصورات درکار بھی ہوتے جیسے وہ ذرائع جن سے متن کا فہم حاصل ہوتا ہے مثلا زبان جاننا، مصنف کو جاننا وغیرہ۔

8۔ اگر اس کا قائل ہوا جائے کہ ہر فہم پیش تصورات و مفروضات پر مبنی ہوتا ہے تو پھر خود یہ فہم بھی پیش تصورات پر مبنی ہو گا اور اس بات کا فہم کہ یہ پیش تصورات پر مبنی ہے، خود کسی نہ کسی پیش تصور پر مبنی ہو گا اور اس سے ایک لامتناہی تسلسل لازم آتا ہے جو عقلاً محال ہے۔

پیش تصورات و مفروضات کی صائب انواع

اس میں کوئی شک نہیں کہ فہم کے عمل اور اس کے متحقق ہونے میں پہلے سے موجود تصورات و مفروضات کا بڑا اثر ہوتا ہے لیکن ہم فلسفیانہ ہرمینیات کی طرح مفسر کو ہر پیش تصور و مفروضہ کا مجبور نہیں سمجھتے بلکہ یہاں ان کا ذکر کریں گے جن کا ہونا ضروری ہے اور جو "فہم" کے تحقق میں اثرانداز بھی ہوتے ہیں۔

اول: قبلیاتِ آلیہ

کسی بھی متن کو سمجھنے اور تشریح کرنے سے پہلے ہمیں اس کی زبان، صرف و نحو اور علم بلاغت کا پتہ ہونا چاہیے۔

دوم: فہم کی گہرائی کے لیے

ہم ان تصورات و مفروضات کو بھی اہم جانتے ہیں جن کے ہونے سے متن کے فہم میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے کسی فقہی متن کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے فقہی ذہن ہونا اور دیگر فقہی معلومات کا ہونا گہرائی پیدا کرتے ہیں۔

سوم: متن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ

جس طرح ہم متن کو سمجھتے ہیں اسی طرح ہم اس کا دیگر چیزوں سے تقابل کر کے مختلف پہلوؤں کو بھی حاصل کرتے ہیں لہذا اس صورت میں بھی پیش تصورات اہم ہیں۔

جیسے قرآن سے اجتماعی، ثقافتی یا اقتصادی پہلو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس پہلے سے ان چیزوں کے متعلق معلومات ہونی چاہیے۔

چہارم: عقلی قرائن تک لے جانے والے تصورات

وہ مفروضات و تصورات بھی ضروری ہیں جو ہمیں عقلی قرائن مہیا کرتے ہیں تاکہ ہم متن کے ذریعہ مصنف کی مراد تک رسائی حاصل کر سکیں۔

جیسے عقلی طور پر طے ہو جائے کہ اللہ جسم و جسمانیت سے پاک ہے تو اب قرآن میں (ید=ہاتھ، وجہ= چہرہ وغیرہ) کے استعمال کو ہم عقلی قرائن کی مدد سے سمجھیں گے کہ یہاں اصل میں کیا مراد ہے؟ مثلا ہاتھ سے مراد قدرتِ خداوندی یا الٰہی سخاوت ہے۔

پنجم: تاریخی قرائن سے پیوست تصورات

پہلے سے موجود وہ مفروضات و تصورات بھی ناگزیر ہیں جن کی اعانت سے مفسر کو تاریخی پس منظر، پیش منظر اور ایک تاریخی سیاق و سباق حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کی روشنی میں متن کو سمجھتا ہے۔ مثلا قرآن کے لیے اسبابِ نزول وغیرہ دیکھنا۔

نظریہ پال ریکور(1913تا2005)

پال ریکور (Paul Ricoeur) دیگر اہم فلسفیوں کی طرح ہرمینیات میں کسی نئی فکر یا فلسفہ کا بنیاد گزار نہیں ہے بلکہ اس نے نمایاں افکار میں تلفیق پیدا کر کے ایک متوازن رائے قائم کی۔

آپ ہائڈیگر کے دازائن، گادامر کے تحققِ فہم، سگمنڈ فرائیڈ کے "تحلیل نفسی " (Psychoanalysis)اور جان راجرز سرل (John Rogers Searle) کے فلسفہِ لسانیات سے متاثر تھے مگر ان کو مکمل قبول کرنے کے بجائے ان میں سے بعض امور پر تنقید کرتے ہوئے اپنی فکر کو قائم کیا۔

پال ریکور کا ماننا تھا کہ ہر انسان حیات سے محبت کرتا اور بقا کو چاہتا ہے لہذا ہمیں انسانی افعال، اجتماعی علامتیں، نفسِ انسانی کے داخلی پہلو اور مختلف آثار کو اس جہت سے سمجھنا اور تفسیر کرنا ہوگا۔

آپ کا یہ فلسفہ ان کی ہرمینیات میں سرایت کیے ہوئے ہے، درج ذیل نکات سے ان کا نظریہ واضح ہوتا ہے:

۱۔ متن کا ساختیاتی اور ظاہری ڈھانچہ اہمیت رکھتا ہے مگر محض اس تک محدودیت کارآمد نہیں بلکہ ہمیں اس کے پیچھے چھپے ہوئے معانی تک رسائی کرنا ہوگی اور یہی ہرمینیات کا کام ہے۔

۲۔ زبان اور کلام میں فرق : زبان اجتماعی اور مشترک ذخیرہ ہوتی ہے لہذا اس میں کسی بھی فرد کی کوئی نیت یا ارادہ کو داخل نہیں ہوتا لیکن "کلام" یعنی جس میں فرد کی نیت جلوہ گر ہو۔ پس "زبان" جب تک "کلام" نہیں بنتی تب تک اس سے کچھ نقل ہونا یا اسے درک کرنا ممکن نہیں۔

۳۔ ڈسکورس (Discourse)

پال ریکور کی فکر میں "ڈسکورس" کا اہم کردار ہے۔ ڈسکورس یعنی کوئی بھی واقعہ جو دورانِ گفتگو یا تکلم وجود پذیر ہوا ہو۔

دراصل پال ریکور کے یہاں ڈسکورس کے تین عناصر ہیں:

الف) متکلم/مصنف وہ عمل جو متکلم کی مدد سے وجود پذیر ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی بات کرے

ب) کلام گفتگو یا کلام سے آخر متکلم کا مقصد کیا ہے؟ جیسے ڈرانا، تشویق، امید دلانا یا سوال مطرح کرنا وغیرہ۔

ج) مخاطب اس کلام کا مخاطب کے یہاں کیا اثر ہوا۔ خوف پیدا ہونا یا امید کا جاگنا وغیرہ

٤۔ کلام و تحریر میں فرق

کلام (speech) اور تحریر (Written) میں درج ذیل چار اہم فرق ہیں:

الف) تحریر میں معنی مقدم ہوتے ہیں اور خود تحریر بعد میں وجود پذیر ہوتی ہے جبکہ کلام میں معنی اور الفاظ ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔

ب) کلام میں متکلم کی نیت و مراد اور کلام کے معانی میں مطابقت پائی جاتی ہے جبکہ تحریر میں ایسی مطابقت ضروری نہیں بلکہ ممکن ہے کہ تحریر سے معنی کچھ اور برآمد ہوں جبکہ لکھنے والے کی مراد کچھ اور ہو۔

ج) کلام میں مخاطب متعین ہوتا ہے کیونکہ اس وقت ماحول اور قرائن موجود ہوتے ہیں جبکہ تحریر میں مخاطب محدود و متعین نہیں ہوتے۔

د) تحریر کی تفسیر لفظی و ظاہری قیود سے آزاد ہو کر کی جا سکتی ہے مگر کلام میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

التفات: گویا تحریر میں مصنف کی نیت جاننا نہیں ہوتا بلکہ تحریر کو ہم یہ سمجھ کر پڑھیں گے کہ مصنف کی موت واقع ہو چکی ہے اور اس کا تحریر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

نوٹ: پال ریکور نے ہمیشہ رموز و اساطیر ہی کو ہرمینیات کا موضوع قرار دیا لیکن اواخر عمر میں انہوں نے ہرمینیات کے لیے "تحریر" کو مرکزیت دی۔

۵۔ معنی اور محکی میں فرق

پال ریکور معنی اور محکی میں تمیز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی بھی متن کے لغوی اور لفظی ساخت سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ معنی ہیں اور معنی کا صادق ہونا یعنی اس کا لغوی قواعد جیسے صرف و نحو و بلاغت کے مطابق ہونا ہے چاہے خارج و حقیقت سے مطابقت نہ ہو لیکن "محکی" وہ بات ہے جو مفسر نے حاصل کی لہذا اس کا سچا ہونا یعنی مفسر کے ذہن کے مطابق ہونا ہے۔

٦۔ کسی بھی متن کی تفسیر کرنے کے لیے پال ریکور تین مراحل بیان کرتے ہیں:

اول: تبیین (Explanation)

لغوی و بیانی ساخت کا سہارا لینا جیسے صرف و نحو، بلاغت اور کسی زبان کے عمومی قواعد وغیرہ کی مدد سے تفسیر کرنا۔

دوم: فہم (Understanding)

متن کی دنیا کو سمجھنا اور اس کی افادیت کو درک کرنا اور ساتھ میں تفسیر کرتے ہوئے اپنی ذات کی معرفت وشناخت کرنا۔

سوم: تملّکِ معنی (Appropriation)

عبارات والفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے معانی تک رسائی حاصل کرنا اور انہیں اپنے وجود کا حصہ بنا دینا۔ یعنی یہ ایسا فہم ہے جو قاری کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ متن کے معانی کو اپنی ذات کا حصہ بنا لے۔

ان تمام مراحل کا نام ہرمینیاتی قوس (Hermeneutical Arc) ہے۔

تنقید

1۔ متن کا اہم مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ ہم مصنف کی نیت ومراد کو سمجھ سکیں جبکہ پال ریکور متن اور مصنف کے درمیان فاصلہ قائم کرتے ہیں۔ کیا خود پال ریکور اس پر راضی ہوں گے کہ کوئی ان کی تحریروں سے وہ بات سمجھے ہی نہیں جو وہ بتانا چاہ رہے ہیں۔!

اور پھر کوئی مصنف کچھ لکھے گا کیوں ؟! اگر اس کی تحریر سے اس کی بات سمجھی ہی نہیں جاسکتی۔

2۔ پال ریکور کا یہ کہنا کہ تحریر میں قرائنِ حالیہ ومقامیہ نہیں ہوتے، درست نہیں؛ کیونکہ خود لفظوں اور جملوں میں وہ قرائن آجاتے ہیں جو حاضر اور غائب دونوں مخاطبین کے لیے برابر کام کرتے ہیں۔

دوم یہ کہ مصنف جب اپنا کلام غائب مخاطبین کے لیے لکھ رہا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنا کلام مبہم، غیر واضح اور مجمل نہ چھوڑے بلکہ اس کا اہتمام کرے۔

3۔ پال ریکور کی یہ بات بھی درست نہیں کہ: تحریر میں مخاطبین محدود نہیں ہوتے لہذا اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ کتنے ہی مصنفین اپنی تحریر میں اس لیے مخاطبین کو معیّن نہیں کرتے کیونکہ ان کا کلام عام ہوتا ہے کہ جو کوئی اس زبان کو جانتا ہے وہ اس کا مخاطب ہوتا ہے۔

4۔ فہم کے متعلق پال ریکور کی یہ رائے کہ وہ اپنے تاریخی و ثقافتی چھاؤں تلے چیزوں کو سمجھتا ہے دراصل فلسفیانہ ہرمینیات سے متاثر ہے جس پر ہم نقد وانتقاد کر آئے ہیں۔

5۔ پال ریکور قائل ہیں کہ: معنی اور محکی میں فرق ہے کیونکہ معنی کا صادق ہونا یعنی لفظوں کے مطابق ہونا ہے چاہے خارج کے مطابق نہ ہو جبکہ محکی کا سچا ہونا یعنی مفسر کے عالمِ ذہنی کے مطابق ہونا ہے۔ یہ درست نہیں؛ کیونکہ الفاظ اور ظاہری ساخت علامات ہیں اور وسیلہ ہیں معانی کو منتقل کرنے کا۔ دوسرے یہ کہ اکثر و بیشتر مفسر کا ہم و غم اپنی ذات اور اپنے ذہنی جہان کو سمجھنا نہیں بلکہ مصنف کی مراد کو سمجھنا ہوتا ہے۔

6۔ پال ریکور نے "ہرمینیاتی قوس" میں تین مراحل کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان کے آپسی تعلق وارتباط کو واضح نہیں کیا اور یہ بھی نہیں بتایا کہ معنی کو مفسر کے لیے کیسے واضح کرتے ہیں۔

پس ہرمینیاتی قوس (Hermeneutical Arc) کا نظریہ خود ایک مبہم اور غیر واضح ہے۔

نظریہ امیلیو بِتّی(1890تا1968)

امیلیو بتی (Emilio Betti) بھی شلائرماخر کے منہج پر چلے اوران کامانناتھاکہ مفسر مصنف کی مراد تک پہنچ سکتاہےاور متن سے ہمیں مصنف کی نیت ہی تک پہنچناہوتاہے۔

اور وہ شلائرماخر کی طرح اس بات کے بھی قائل تھے کہ ہمیں متن کی لسانی ساخت کے ساتھ ساتھ مصنف کے ذہنی، نفسیاتی، تاریخی اور ثقافتی پہلوؤں کو بھی دہراکراس کامتن سمجھناہوگا۔

لہذاامیلیو بتی نے چار قواعد بتائے جن کی رعایت سے مفسر (یاقاری) متن کے ذریعہ مصنف کی نیت و مرادتک پہنچ سکتاہے۔

پہلا قاعدہ: متن اور مصنف کے ذہن میں دوئیت نہیں ہوتی پس متن مصنف کے تصورات کاوسیلہ ہے اور مفسر و قاری اس تک رسائی حاصل کرسکتاہے۔

اس قاعدہ سےامیلیو بتی نے تشکیکیت اور نسبیت کورد کیااوراس بات کاباب بند کیاکہ جتنے فہم ہوں گے اتنی متن کی تشریحات ہوں گی اور ہم تمام تشریحات کودرست ہی سمجھیں گے۔

دوسرا قاعدہ: ایک جملے کے اجزاء کاپورے جملے کے ساتھ اور پھرایک جملہ کااپنے سیاق وسباق کے ساتھ گہرا ربط و تعلق ہوتاہے لہذاہمیں ان سب کو سامنے رکھ کرمتن سمجھناچاہیے

تیسرا قاعدہ: مفسر کوان تمام حالات (ذہنی، نفسیاتی، تاریخی و ثقافتی) کااعادہ کرناہوگاجن سے مصنف گزراہےتاکہ وہ متن کودرست طرح سے سمجھ سکے۔

چوتھا قاعدہ: مفسر کو چاہیے کہ وہ اپنی علمی، ذہنی اور معنوی صلاحیتوں کو اس طرح ترتیب دے کہ وہ مصنف کی نیت اور متن کے اصل مفہوم کو اس طرح سمجھ سکے جیسا مصنف چاہتا ہے۔

پس مفسر کے پاس معلومات، تصورات اور صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے جن کی مدد سے وہ مصنف کی نیت و مراد تک پہنچ سکے۔

یہ ان پیش تصورات و مفروضات سے جدا ہے جن کا گادامر قائل ہے کیونکہ گادامر کے یہاں پیش تصورات سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہے اور اس سے ہر مفسر کا فہم و تناظر الگ ہو جاتا ہے لہذا متن کے ذریعہ مصنف کی اصل مراد و نیت تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا جبکہ امیلیو بتی مصنف کی نیت تک رسائی کا قائل ہے۔

اشکال: مفسر کا ذہن ان پیش تصورات و مفروضات سے خالی نہیں ہو سکتا ہے جو تاریخ و ثقافت کے تسلسل میں پیدا ہوتے ہیں، لہذا حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

جواب: امیلیو بتی اس فکر پر تنقید کرتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ حقیقت مفسر کے فہم سے وسیع تر ہے اور تاریخ و ثقافت سے اس کے پاس ایک اجمالی علم آتا ہے جو حقیقت و واقع کو سمجھنے کے لیے مانع نہیں ہو سکتا۔ امیلیو بتی کی فکر میں ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ متن سے دو طرح کے معنی اخذ ہوتے ہیں:

اول: ارادی معنی (Meaning)

دوم: تناظری معنی (Significance)

"ارادی معنی" وہ ہوتے ہیں جو مصنف کی مراد ہوتے ہیں جس کو وہ متن سے ظاہر کرتا ہے لہذا مفسر کو اس تک پہنچنا ہوتا ہے اور یہی اصل معنی ہوتے ہیں۔ جبکہ "تناظری معنی" قاری و مفسر کے زمان و مکان، علمی سطح، نظریاتی پس منظر، اور ذہنی افق سے پیدا ہونے والا مفہوم ہوتا ہے۔

تنقید

امیلیو بتی کا "تناظری معنی" کے متعلق یہ کہنا کہ اس پر مفسر کا تناظر اور اس کے پیش تصورات اثر انداز ہوتے ہیں، ہمیں بتاتا ہے کہ گویا "تناظری معنی" حقیقت اور مصنف کی مراد تک نہیں پہنچنے دیتا۔

یہ بات درست نہیں ہے؛ کیونکہ متن کے دونوں معنی جو مصنف کی تصنیف میں لفظوں میں موجود ہیں اور وہ معنی جو ہمارے لیے ظاہر ہوئے ہیں، واقع اور مصنف کی مراد تک پہنچا سکتے ہیں یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ پیش تصورات اور مفسر کے پاس پہلے سے موجود معلومات حقیقت کی رسائی کے لیے رخنہ ڈالیں۔

نظریہ ڈونلڈ ہرش (پیدائش:1928)

ہرمینیات کے نمایاں ترین مفکرین و فلسفیوں میں سے امریکی مفکر ڈونلڈ ہرش (Eric Donald Hirsch) بھی ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ درست فہم اور غلط فہم میں فرق کیا جا سکتا ہے اور ہم متن کے ذریعہ سے مصنف کی نیت و مراد کو جان سکتے ہیں۔

لہذا انہوں نے وہ قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی جس سے درست طور پر متن سے نتائج اخذ کیے جا سکیں اور غلط فہمی و سوئے فہم سے بچا جا سکے۔

ذیل میں ان کی فکر کے اہم نکات ملاحظہ ہوں:

1۔ متن کے وہی معنی صحیح قرار دیے جائیں گے جن کا مصنف نے ارادہ کیا ہو گا؛ کیونکہ متن مصنف سے جداگانہ وجود نہیں ہے۔

2۔ معانی مصنف کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور الفاظ محض ان معانی کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں لہذا مصنف ہی اپنی تصنیف میں الفاظ و معانی کے مابین ربط قائم کرتا ہے۔

3۔ارادی معنی (Meaning) اور تناظری معنی (Significance) میں فرق ہے کیونکہ ارادی معنی کبھی بھی نہیں بدلتے اور مستقل و ثابت رہتے ہیں جبکہ تناظری معنی مخاطب، خارجی حالات اور ظروف وغیرہ کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں۔

4۔ کسی بھی متن سے ہمارا تعامل چار طرح سے ہو سکتا ہے:

الف) فہم (Understanding)

کسی بھی متن کے لفظی معنی سمجھنا اور متن میں موجود سیاق وسباق کی رعایت سے اخذ شدہ معانی "فہم" کہلاتا ہے۔

ب) تفسیر (Interpretation)

متن کے لفظی معنی دوسروں کو بیان کرنا اور سمجھانا۔ "فہم" متن کے حقیقی معنی تک رسائی حاصل کرتا ہے جبکہ "تفسیر" میں ہم تناظری معنی کی طرف چلے جاتے ہیں جو نسبیت لے آتا ہے۔

ج) حکم وقضا (Judgment)

متن کو سمجھ لینے کے بعد متن کے معانی اور قابل قبول معیارات میں تقابل کرنا اور یہ فیصلہ کرنا متن ان معیاروں میں کیسے تطبیق پیدا کی۔

د) انتقاد (Criticism)

متن کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ کرنا اور متن سے حاصل شدہ مضامین و معانی کو مصنف کی نیت پر تطبیق کرنا۔

فرق: فہم کا باقی تین اقسام سے ایک بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ فہم کے اخذ شدہ معنی صائب، ثابت، متعین اور مصنف کی مراد ہوتے ہیں جبکہ باقی تین کا تعلق لفظی معنی سے نہیں ہوتا بلکہ تناظری معنی کے تحت وہ مخاطب، حالات اور ظروف بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں۔

5۔ غور کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہرش نے ہرمینیات کا دائرہ محدود کیا اور بتایا کہ محض لفظی معنی کا حصول اور مصنف کی مراد کشف کرنا ہی ہرمینیات کا کام ہے۔

6۔ متن سے درست معنی حاصل کرنے اور مصنف کی مراف تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ قاری ان تمام حالات کو سمجھیں جن سے مصنف گزرا ہے جیسے ثقافتی، تاریخی، نفیساتی و فکری وغیرہ۔

7۔ مفسر جب متن پڑھنے لگتا ہے تو اس دوران اسے ایک "وجدانی ادراک (حدس)" حاصل ہوتا ہے، اب وہ معنی یا تو درست ہوگا یا غلط لیکن اس کا فیصلہ قواعد کی رو سے کیا جائے گا۔

8۔ مفسر (یا قاری) کبھی بھی قطعی و حتمی صورت میں مصنف کی مراد نہیں سمجھ سکتا بلکہ وہ مختلف شواہد و قرائن کی مدد سے ان معنی کو حاصل کرتا ہے جو واقع اور حقیقت کے قریب تر ہوتے ہیں۔

تنقید

1۔ ہرش پر بنیادی اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ انہوں نے "وضع" اور "استعمال" میں خلط کر دیا ہے؛ کیونکہ الفاظ میں استعمال سے پہلے ہی معانی موجود ہوتے ہیں جنہیں علمائے اصول الفقہ "مدلول تصوری" کہتے ہیں۔ پس لفظ اور مصنف کی مراد کا وہ تعلق جو ہرش نے سمجھا ہے درست نہیں؛ کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ لفظ نعانی سے بلکل ہی عاری و خالی ہوتے ہیں بلکہ "وضع" کی وجہ سے ان میں معانی ہوتے ہیں تاہم مصنف کا ان کو استعمال کرنا ہمیں اس کی مراد بتاتا ہے اور ہمیں "مدلول تصدیقی" حاصل ہوتا ہے۔

2- دوسری مشکل ہرش کے نظریہ میں یہ ہے کہ اس کے نزدیک متن کے لفظی معنی مصنف کی نیت و مراد کی وجہ سے قائم ہوتے ہیں گویا یہ معاملہ شخصی ہو جاتا ہے جبکہ لفظوں کا فہم مشترک اور عمومی ہوتا ہے، اسی وجہ سے عرف و معاشرہ میں بات چیت ہوتی ہے۔ پس معانی مصنف کے ذہن میں موجود شخصی و فردی نہیں ہیں کہ جنہیں ہم مشترک نہ سمجھیں۔

3۔ ہرش نے ارادی معنی اور تناظری معنی میں یہ فرق کیا ہے کہ ارادی معنی مستقل، ثابت اور غیر متغیر ہوتے ہیں جبکہ تناظری معنی متغیر، سیّال اور غیر متعین ہوتے ہیں۔

یہ کسی بھی طور درست نہیں؛ کیونکہ "فہم" اور "تفسیر" میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا، مفسر وہی کچھ دوسروں کو سمجھاتا ہے جو متن سے برآمد ہوتا ہے لہذا متن سے حاصل شدہ فہم کو ثابت و مستقل ماننا جبکہ تفسیر کو متغیر ماننا غلط ہے۔

4۔ ہرش نے "وجدانی ادراک (حدس)" کو مبہم چھوڑا ہے؟

دوسرے یہ کہ عرف و معاشرہ میں ہم گفتگو اور باتوں کو اس طرح نہیں سمجھتے ہوتے۔

5۔ اگر مفسر متن سے قطعی و حتمی طور پر مصنف کی مراد نہیں سمجھتا بلکہ شواہد و قرائن کی مدد سے واقع و حقیقت کے قریب تر والے معنی اخذ کرتا ہے تو پھر ہرش پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ "مصنف کی مراد" یہاں بھی ہمیں حتمی طور پر حاصل نہ ہوئی اور ہم فلسفیانہ ہرمینیات کی طرح تشکیکیت کی طرف جا پڑیں گے جس کے خود ہرش ناقد ہیں۔

نظریہ مصنف: مصطفی عزیزی

آپ کے نظریہ کی بنیاد "سیرتِ عقلاء" ہے کہ اہل عقل دنیا میں بات چیت، گفتگو کرتے، ایک دوسرے کی بات سمجھتے سمجھاتے اور اس پر مبنی افعال انجام دیتے ہیں تو اس پر اعتماد کر کے قواعد مرتب کیے جائیں گے۔ درج ذیل نکات آپ کی فکر کے اہم اصول ہیں:

1۔ ہر متن مختلف الفاظ و کلمات سے مل کر بنتا ہے اور ان لفظوں سے معانی کا حصول ہمیں درست فہم تک لے جاتا ہے لہذا اس میں لفظی قرائن کے ساتھ ساتھ قرائنِ حالیہ بھی مد نظر رکھے جائیں جن کا الفاظ و کلمات کے سمجھنے سے گہرا تعلق ہے۔ پس مفسر کے سمجھنے سے پہلے ہی لفظ معانی سے مملو ہوتے ہیں۔

2۔ متن کو سمجھنے سے ہماری مراد مصنف کی نیت و مراد کو سمجھنا ہے اور ہر متن کا ہدفِ نہائی یہی ہوتا ہے کہ مصنف کی مراد سمجھی جا سکے۔

3۔ مصنف و متکلم کی مراد کشف کرنے اور اس کو سمجھنے کا ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح معاشرہ میں عقلاء اور سمجھدار لوگوں کی سیرت قائم ہے اسی پر اعتماد کیا جائے۔

4۔ ہر فہم صحیح نہیں ہوتا بلکہ صحیح فہم کو غلط اور سوئے فہم سے جدا کرنے کے معیارات ہیں۔

5۔ متن کو سمجھنے میں مفسر کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہی معانی کو اخذ کرے جو مطابقِ واقع ہیں لہذا وہ پیش تصورات و مفروضات پر اعتماف نہیں کر سکتا۔

6۔ متن اور مفسر کے مابین زمانی فاصلہ اس بات سے نہیں روکتا کہ اب متن سے مصنف کی مراد نہیں سمجھی جاسکتی۔ پس مفسر لفظی، تاریخی اور خارجی (سیاقی) قرائن کی مدد سے مصنف کی نیت و مراد کو متن سے سمجھ سکتا ہے۔

مفسرین میں اختلاف کے اسباب

اگر الفاظ مفسر کے سمجھنے سے پہلے ہی معانی کو حامل ہوتے ہیں تو پھر مفسرین میں اختلافات کیوں ہوتے ہیں؟ اس اشکال کا جواب مصنف یوں دیتے ہیں:

مفسرین انہی قواعد کو اپناتے ہیں جو عرف و معاشرہ میں عقلاء کے یہاں رائج ہوتے ہیں اسی لیے اکثر قرآنی آیات میں اختلاف نظر نہیں آتا لیکن بعض آیات میں اختلاف کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ہم بعض کا ذکر کرتے ہیں:

الف) ایک لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں تو مفسرین اس کے تعین میں اختلاف برت جاتے۔

ب) مجاز و حقیقت کوئی کسی لفظ کو حقیقی معنی پر محمول کرتا تو کوئی اسے مجاز پر محمول کرتا ہے لہذا اختلاف ہو جاتا۔

ج) حروف میں اختلاف ہوتا، وہ یوں کہ کسی کے نزدیک مثلا "و" عاطفہ ہے تو کوئی اسے حالیہ مانتا ہے اور معانی الگ الگ ہو جاتے۔

د)قرآن میں ضمائر(هو، هم، هي وغیره)موجودہین لہذاان کاکوئی نہ کوئی مرجع ہوتاہے جس کی طرف یہ پلٹتی ہیں اب مفسرین اسے الگ الگ جانب پلٹاتے اور اختلاف ابھر آتا۔

ھ)کسی لفظ کے مجمل ہونے کی وجہ سے بھی اختلاف ہوتا

و)شان نزول اور اسباب نزول کے الگ ہونے سے بھی بعض آیات کی تفہیم میں اختلاف ہوتا ہے۔

ز)مفسرین جن مصادر پر بھروسہ کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں تو وہ مصادر مفسرین میں الگ ہو جاتے تو آیات کی تفہیم میں بھی اختلاف ہو جاتا۔

مثلا کوئی کہتا قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے ہو گی تو کوئی قرآن کی تفسیر احادیث سے کرنا چاہتا اور کسی کے یہاں کشف و شہود سے قرآن کی تفسیر کی جاسکتی وغیرہ وغیرہ۔

اختتامیہ

یہاں ڈاکٹر مصطفی عزیزی کا پیش کردہ تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ تمام ہوتا ہے جس کا ہم نے اردو میں خلاصہ پیش کیا اور ہماری کوشش رہی کہ طوالت سے بچا جائے مگر اس کے پہلو بہ پہلو مطالب کی وضاحت بھی ہو اور دیانتداری سے ان کا نقطہ نظر سامنے آئے لہذا ہم نے کہیں بھی نہ اپنا اتفاق ظاہر کیا اور نہ اختلاف کا اظہار کیا۔ ہم اس تلخیص میں کہاں تک کامیاب ٹھہرے ہیں اس کا فیصلہ تو آپ قارئین کو ہی کرنا ہے۔

والسلام

18جون2025

نجف اشرف